اسلامی فقہ میں افتاء، مفتی و مستفتی کے آداب

*سید عبدالمالک آغا

Abstract

" Ifta " is a great and incomparable institution of Islamic judicial system. There are specific etiquettes for Fatva (legal opinion), Mufti (muslim councsel) and Mustaf,ti (the person who seeks legal opinion). Every muslim is bound to abide by these etiquettes. So that the dignity and greatness of Islamic Law could be maintained.

Keywords: *Important of Ifta, Mufti, Mustafti, Islamic Law*

ادارۂ افتاء اسلامی نظام عدل وقضاء کا ایک عظیم ترین ادارہ ہے۔اس کا سلسلہ چونکہ عہد نبوی سے شروع ہوتا ہے۔اس لئے اس کی تاریخ بھی اتنی پرانی ہے جتنی خود دین اسلام کی،ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے مفتی اعظم خود رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔قرآن حکیم کی سورۃ النسآء میں "افتاء" کی نسبت خود رب کائنات کی طرف کی گئی ہے جس سے اس منصب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔الغرض قرآن وحدیث اور فقہ میں اس شعبے کی اہمیت وفضیلت کے پیش نظر ایسے زرین اور اعلی اخلاقی اصول وضع کئے گئے ہیں جو اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے والوں کیلئے مشعل راہ ہیں۔

فتویٰ کی تعریف:

مفتی کے حکم شرعی کو واضح کرنا فتویٰ ہے۔امام راغب نے فتویٰ کی تصریح یوں کی ہے:

"الفُتیاء وَالفتویٰ الجواب عمایشکل من الاحکام ویقال استفتیت فافتا بکذا" (۱)

"مشکل احکام کے جواب دینے کو فتویٰ اور فتیاء کہتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ میں نے اس سے استفتاء کیا اور اس نے مجھے اس طرح جواب دیا"

ایک معروف لغت میں فتویٰ کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں:

"مَاأ فتی بِهِ الفقیهُ " (۲)

*ڈین، فیکلٹی آف ایجوکیشن اینڈ ہیومینیٹیز، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

"فتویٰ وہ ہے جو کسی فقیہ کی جانب سے دیا جائے۔"

علاوہ ازیں لغت کی ایک اور کتاب میں ہے:

"الفُتیا والفتویٰ لغة ماافتی به الفقیه ویقال افتاه فی الامر ابانه له و منه افتی العالم اِذابین الحکم" (۳)

"فتیا اور فتویٰ لغت میں فقیہ کے بیان کردہ مسئلہ شرعی کو کہتے ہیں چنانچہ **"افتاه فی الامر "** حکم بیان اور واضح کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ **"افتی العالم "** یعنی عالم نے حکم شرعی واضح کیا"۔

غرض یہ کہ کسی باصلاحیت عالم دین کا حکم شرعی کو بیان کرنا فتویٰ ہے جو شخص فتویٰ دیتا ہے اسے مفتی کہتے ہیں اور مسئلہ دریافت کرنے والا سائل یا مستفتی کے نام سے موسوم ہے۔

علماء وفقہاء نے افتاء کے اصول وآداب کو مفصل بیان کیا ہے جسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(الف) فتویٰ کے اصول وآداب

(ب) اصول وآداب برائے مفتی

(ج) اصول وآداب برائے مستفتی

(الف) فتویٰ کے اصول وآداب

مجمل ومبہم سوالات کے جوابات:

اگر سوال مجمل اور غیر واضح ہو یا غیر منقح ہو تو جواب لکھتے وقت مفتی جلد بازی سے کام نہ لے، بلکہ جواب دینے سے قبل سوال کی توضیح کرائے بتصریح ابن صلاح "اگر مفتی نے سوال کو بالکل نہ سمجھا ہو اور نہ صاحب واقعہ ہی وہاں حاضر ہو (کہ اس سے پوچھ لیا جائے) تو قاضی ابوالقاسم صمیری شافعیؒ سے روایت ہے کہ اس صورت میں قاضی کو یہ لکھنا چاہیے کہ اس سوال کو مزید وضاحت سے لکھا جائے تاکہ ہم اس کا جواب دیں یا یہ لکھے کہ میں اس سوال کو نہیں سمجھ سکا کہ اس کا جواب دوں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس صورت میں بالکل کچھ بھی تحریر نہ کریں۔" (۴)

عصر حاضر کے علماء وفقہاء کو بھی یہ مسئلہ درپیش ہے کہ لوگ عموماً مجمل اور غیر واضح سوالات بھیجتے ہیں جن

سے مفتیوں کو پریشانی لاحق ہوتی ہے جیسا کہ اس صدی کے مفکر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے:

"لوگ خطوط میں ایسے گنجلک سوالات بھیجتے ہیں کہ مجھے بڑا خلجان ہوتا ہے سب امور کی تنقیح خط لکھنے والے سے کس طرح ممکن ہے۔ایسی صورت میں تو یہ لکھ دیتا ہوں کہ کسی عالم سے زبانی پوچھ لو اور بعض اوقات تنقیحات بھی قائم کر کے لکھ بھیجتا ہوں لیکن اس صورت میں لکھتے وقت ممکن ہے کہ کوئی تنقیح ذہن میں نہ آئے اور پوچھنے سے رہ جائے"۔(۵)

فتویٰ میں حکیمانہ طرز:

اگر مفتی ضروری سمجھے تو وہ مستفتی کی اصلاح کی خاطر جواب میں حکیمانہ طرز اختیار کر سکتا ہے۔امام نوویؒ نے اس حقیقت کو یوں اجاگر کیا ہے:

"صمیریؒ نے کہا ہے کہ مفتی جب یہ دیکھے کہ مصلحت اس میں ہے کہ عامی کو غلط فتویٰ دیا جائے، وہ اس کے ظاہر پر اعتقاد نہ رکھتا ہو بلکہ اس کی تاویل کرتا ہو تو اسے گناہ سے روکنے کیلئے غلط فتویٰ دینا جائز ہے۔جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ان سے ایک قاتل نے توبہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کیلئے توبہ نہیں ہے (اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی)۔اور جب ایک دوسرے قاتل نے ان سے یہی سوال پوچھا تو آپ نے فرمایا ہاں اس کی توبہ قبول ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ جان لیا تھا کہ شخص اوّل کی آنکھوں میں ارادہ قتل ہے تو میں نے اسے باز رکھنے کیلئے یہ فتویٰ جاری کیا جبکہ دوسرا آدمی قتل کے بعد فتویٰ پوچھنے آیا تھا تو میں نے اسے نا اُمید نہیں کیا۔"(۶)

متاخرین علماء کا مسلک بھی یہی ہے چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرت میں نے چاروں کے کنوئیں سے پانی پی لیا ہے۔فرمایا کہ توبہ کرلو اور آئندہ ایسا مت کرنا، جب وہ شخص چلا گیا تو فرمایا کہ یہ میں نے اس لئے کہا کہ تاکہ دل میں رکاوٹ رہے آگے نہ بڑھے، نفرت پیدا ہو(۷)۔یہی وجہ ہے کہ بوقت ضرورت مستفتی کو پریشان کیا جا سکتا ہے۔مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ ایک شخص نے بذریعہ خط دریافت کیا کہ "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیاً اللہ! کے وظیفہ کا کیا حکم ہے؟ آگے عبارت گستاخانہ تھی کہ اس کا حکم آپ کو کہاں تک معلوم ہے؟ جواب لکھا کہ حکم سے کیا مراد ہے منصوص یا مستنبط۔وہ اس سوال کے چکر سے مدت تک بھی نہیں نکل سکتا یہ اس کی گستاخی کی سزا تھی"(۸)۔پس مفتی مسائل دریافت کرنے والوں کو برائی سے روکنے اور ادب سکھانے کی غرض سے فتویٰ میں حکیمانہ طرز اختیار کرنے کا مجاز ہے۔

تفصیل طلب مسئلے کو مجمل نہ لکھنا:

فتویٰ لکھنے کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ جواب اجمالاً نہ دیا جائے بلکہ اسے مفصل ضبط تحریر میں لایا جائے۔

ابن قیم نے لکھا ہے:

"ليس للمفتي ان يطلق الجواب في مسئلة فيها تفصيل" (۹)

" تفصیل طلب مسئلہ میں یہ درست نہیں ہے کہ مفتی اجمالی جواب دے"۔

لیکن اگر جواب تفصیل طلب نہ ہو اور اس میں کسی قسم کا ابہام نہ پایا جاتا ہو تو اس صورت میں مفتی فتویٰ ، میں اختصار سے کام لے سکتا ہے۔ابن صلاح نے اس کی تصریح یوں کی ہے :

"ہمیں قاضی ابوالحسن الماوردی صاحب کتاب الحاوی سے یہ بات پہنچی ہے کہ مفتی کو چاہیے کہ وہ جواب مختصر لکھے اور اسی پر اکتفاء کرے کہ یہ جائز ہے یا یہ جائز نہیں ہے یا یہ حق ہے یا یہ باطل ہے، اسے چاہیے کہ طوالت اور استدلال کو اختیار نہ کرے تاکہ فتویٰ اور تصنیف میں فرق ہو۔"(۱۰)

استدلال اور حوالہ جات:

یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ فتویٰ میں دلیل کے اظہار سے اس کے حسن و جمال میں اضافہ ہو جاتا ہے بتصریح ابن قیم:

"بعض لوگوں نے استدلال کو فتویٰ میں معیوب قرار دیا ہے حالانکہ ایسا کہنا خود عیب قرار دینے والے کیلئے معیوب ہے، اس لئے کہ دلیل کا اظہار فتویٰ کا حسن و جمال ہے"(۱۱)۔لیکن ہر کس و ناکس سے دلیل بیان نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ اس صدی کے مفکر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے عصری تقاضوں کے پیش نظر استدلال کی بجائے نقل ہی پر زیادہ زور دیا ہے:

"فرمایا کہ سمجھ دار اور تحقیق پسند لوگوں سے دلیل بیان کرنا اور تشفی کر دینا مناسب ہے، واجب یہ بھی نہیں اِلا آنکہ معلّم تنخواہ اسی کو پاتا ہو۔آج کل کوڑ مغزوں کیلئے نقل ہی کی زیادہ ضرورت ہے درایت کا آج کل زمانہ نہیں۔"(۱۲)

الغرض باصلاحیت افراد سے تو دلیل بیان کرنا مستحسن ہے لیکن جہلاء سے دلیل بیان کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔

عصر حاضر میں حوالہ جات کی اہمیت میں خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا ہے۔زمانہ قدیم میں حوالہ دیتے وقت اختصار سے کام لیا جاتا تھا لیکن آج کل ان کی مکمل تفصیلات دینا ضروری ہے۔مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس حقیقت کو یوں واشگاف کیا ہے:

"صاحب ہدایہ حدیث کے حافظ تھے اس لئے ان کو حدیث کے حوالہ کی ضرورت نہ تھی اور اس وقت اتنا ہی کافی تھا کہ حدیث میں آیا ہے مگر اس زمانہ میں چونکہ تدین نہیں رہا (اس لئے آج کل) حوالہ میں صفحہ وسطر سب کچھ لکھنا چاہیے تاکہ دوسرا دیکھ سکے" (۱۳)۔

طریق حوالہ سے متعلق مفتی عزیز الرحمٰن نے لکھا ہے:

"آج کل حوالہ کا طریقہ یہ ہے کہ جس مستند کتاب سے مسئلہ لیا گیا ہے اس کی عبارت نقل کر دے اور اس کے صفحات و باب کا حوالہ دے دے۔"(۱۴)

مستند کتابوں کا حوالہ:

آج کل مفتیوں کی کوشش یہ ہے کہ سب سے پہلے مستند اور قابل اعتماد کتابوں سے فتویٰ دیں۔ امام طحطاویؒ طریق نقل سے متعلق رقم طراز ہیں:

"نقل کے دو طریقے ہیں، ان میں سے کوئی ایک ہو یا اس مسئلہ میں مسلسل اس کے پاس سند ہو، یا ایسی مشہور و معروف کتاب سے لیا گیا ہو، جو علماء میں مقبول و رائج ہو جیسے امام محمدؒ کی تصانیف مشہورہ یا ان جیسی دوسری کتابیں، اس لئے کہ یہ بھی خبر متواتر و مشہور کے درجہ کی چیز ہے"(۱۵)۔ بتصریح مفتی عزیز الرحمٰن:

"اور کوئی شبہ نہیں کہ اس سلسلہ میں آج کل دوسری ہی صورت اسلم اور محکم ہے اور اسی پر موجودہ مفتیوں کا عمل بھی ہے کہ وہ حکم کرنے کے بعد کسی معتمد کتاب کی عبارت نقل کر دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جس حد تک صریح جزئیہ مل جائے اچھا ہے۔"(۱۶)

ابن خلیل کے نزدیک فتویٰ میں غیر مستند کتب پر اعتماد کرنا درست نہیں۔ اور جدید عہد کی تصانیف جب تک قابل اعتماد ہونے کی حیثیت سے علماء کے درمیان تسلیم شدہ نہ ہوں۔ فتویٰ کیلئے معتمد نہیں۔ جب تک ان کتابوں میں دیئے ہوئے حوالوں کا اصل کتابوں سے مقابلہ نہ کر لیا جائے۔(۱۷)

مفتی کا کسی ایک جانب میلان:

مفتی کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ سوال کا جواب لکھے تو اس کا میلان مستفتی یا فریق مخالف کی جانب نہ رہے بقول ابن صلاح:

"مفتی کو چاہیے کہ اس بات سے بچے کہ وہ اپنے فتویٰ میں مستفتی یا اس کے مدمقابل کی طرف

(ناحق) مائل ہو،اس ناحق میلان کے طریقے کئی ہوسکتے ہیں جوکہ مخفی نہیں ہیں،ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو بات اس کے حق میں ہووہ تو لکھ دے مگر جواس کے خلاف ہواسے نہ لکھے"(۱۸)۔الغرض مفتی پابند ہے کہ وہ مستفتیوں کے مابین عدل وانصاف اورمساوات کوقائم رکھے۔

فتویٰ کے شروع اورآخر میں لکھے اور کہے جانے والے الفاظ:

مفتی کیلئے مستحب ہے کہ وہ اپنے فتویٰ کا تسمیہ اورحمد وصلوٰۃ سے آغاز کرے۔نیز مفتی جب فتویٰ لکھنے کا ارادہ کرے تواسے چاہیے کہ تعوذ،آیات کریمہ،دعاء ماثورہ اوردرودشریف کو پڑھے بقول ابن صلاح:

"مفتی وغیرہ کیلئے مستحب یہ ہے کہ جب وہ فتویٰ دینے کا ارادہ کرے تو کہے کہ میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں (تو پاک ہے جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے ،اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں بے شک تو دانا(اور)حکمت والا ہے) (یہ ہم نے سلیمانؑ کوسمجھا دیا تھا)۔ اے اللہ! تو پاک ہے،ہم تیری رحمت وشفقت کے طلب گار ہیں،اے اللہ! تو مجھے نہ بھول اور نہ مجھے بُھلا۔تمام افضل تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔اے اللہ! تو حضرت محمدﷺ پر،آپؐ کی آل پراورتمام انبیاء علیہم السلام پرصلوٰۃ وسلام بھیج۔اے اللہ ! تو مجھے توفیق عطا فرما، ہدایت عطا فرمااور مجھے صحیح کام کرنے کی توفیق عطا فرمااوردوستی اورثواب کومیرے لئے جمع فرمادے۔اور مجھے غلطی اورمحرومی سے پناہ دے آمین۔"(۱۹)

امام نوویؒ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مفتی کوچاہیے کہ جب فتویٰ دینے کا ارادہ کرے تو دعا کرے۔

مکحولؒ اورامام مالکؒ کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ اس وقت تک فتویٰ نہ دیتے جب تک لاحول ولاقوۃ الا باللہ نہ پڑھ لیتے تھے۔"(۲۰)

مفتی کیلئے مستحب ہے کہ فتویٰ کے آخر میں بھی دعائیہ کلمات تحریر کریں جیسا کہ امام نوویؒ نے لکھا ہے:

"صمیری فرماتے ہیں کہ مفتی کوچاہیے کہ وہ اپنے جواب کے آخر میں اس طرح کے الفاظ ضرور لکھے "باللہ التوفیق"یا "واللہ اعلم" یا"واللہ الموفق"(۲۱)

ب۔اصول وآداب برائے مفتی

اسلام،عدالت،عقل وفہم اورحاضر دماغی:

مفتی کیلئے لازمی ہے کہ وہ مسلمان، عادل، صاحب عقل وفہم اور بیدار دماغ ہو چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"مفتی کیلئے اسلام وعقل کی شرط میں سے کسی کا اختلاف نہیں، بلکہ بعض علماء نے اس کیلئے بیدار دماغ ہونا بھی شرط قرار دیا ہے۔"(۲۲)

ابن عابدین شامیؒ نے بھی اپنے دور کے تقاضوں کے پیش نظر بیدار دماغی کی شرط کو لازمی قرار دیا تھا۔ان کی نظر میں مفتی کی غفلت سے عظیم نقصان کا خدشہ ہے۔"(۲۳) عصر حاضر میں تو اس شرط (حاضر دماغی) کی اہمیت میں اور اضافہ ہونے لگا ہے۔کیونکہ فقہاء پر نت نئے مسائل کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے جن کا حل تلاش کرنے کیلئے مفتیوں کا دور اندیش اور حاضر دماغ ہونا شرط ہے۔

مفتی کا صفت عدل سے متصف ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ جو مفتی فسق وفجور میں مبتلا رہیگا وہ کار فتویٰ سرانجام دینے کی صلاحیت سے محروم ہو جائیگا۔

بقول ابن نجیم:

"مفتی کیلئے اسلام اور اس کا عادل ہونا شرط ہے پس فاسق کا فتویٰ رد کر دیا جائیگا۔"(۲۴)

اس مسئلہ سے متعلق علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔علماء متاخرین کے خیال میں فاسق کا مفتی ہونا درست نہیں ہے۔چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں درج ہے:

"فاسق مفتی ہوسکتا ہے اور بعضوں نے کہا کہ نہیں ہوسکتا ہے۔عینی نے فرمایا کہ اسی (رائے) کو اکثر متاخرین نے اختیار کیا ہے (یعنی فاسق فتویٰ نہیں دے سکتا) اور مجمع اور اس کی شرح میں اسی پر یقین کیا ہے"(۲۵)۔

ابن صلاح نے لکھا ہے:

"فاسق کا فتویٰ صحیح نہیں ہے خواہ وہ مستقل مجتہد ہو ہاں البتہ اگر اسے خود کوئی واقعہ پیش آئے تو وہ اپنے اجتہاد سے عمل کرے اور کسی سے فتویٰ نہ لے۔"(۲۶)

آزاد، ناطق اور مرد ہونا:

ضروری نہیں ہے کہ مفتی آزاد اور ناطق ہو اور نہ ہی اس کا مرد ہونا شرط ہے۔چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"اس کا (مفتی) آزاد ہونا یا مرد کی جنس سے ہونا یا ناطق ہونا کہ جو باتیں کرسکتا ہو شرط نہیں ہے۔ پس گونگے کا فتویٰ دینا درست ہے جبکہ اس کا اشارہ سمجھ میں آجائے بلکہ جو شخص بولنے کی صلاحت رکھتا ہو اس کے باوجود اگر اس نے سوال کے جواب میں سر ہلایا یعنی ہاں تو اس پر عمل کرنا جائز ہے۔"(۲۷)

علم وفہم:

مفتی کا عالم ہونا شرط ہے۔ ابن قیم نے ابوالفرج کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص بغیر علمی بصیرت کے کار افتاء انجام دیتا ہے اس پر زمین اور آسمان کے فرشتے لعنت برساتے ہیں۔"(۲۸)

امام مالکؒ نے فرمایا:

"ماافتیت حتی شهدلی سبعون انی اهل لذلک" (۲۹)۔

"میں نے اس وقت تک فتویٰ کی جرأت نہیں کی جب تک ستر (۷۰) اکابر نے میری اہلیت کی شہادت نہیں دی۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"جو شخص لوگوں کے تمام سوالات کا جواب دینے کیلئے تیار بیٹھا رہے وہ "پاگل" ہے۔"(۳۰)

الغرض مفتی کا فریضہ ہے کہ وہ اس اہم ذمہ داری کا احساس کرے، پوری بصیرت سے کام لے اور سوچ سمجھ کر جواب دے۔

عصر حاضر میں اجتہاد کی شرط:

اجتہاد سے متعلق متقدمین اور متاخرین علماء کے درمیان قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ علماء متقدمین کے نزدیک مفتی کیلئے لازمی ہے کہ وہ مجتہد ہو۔ ابن ہمام نے مفتی کیلئے اجتہاد کو لازمی قرار دیا ہے جیسا کہ ابن عابدینؒ نے لکھا ہے:

"اصولیین کی رائے طے پا چکی ہے کہ مفتی وہی ہے جو مجتہد ہو، باقی وہ غیر مجتہد شخص جو مجتہد کے اقوال یاد رکھتا ہے مفتی نہیں ہے۔"(۳۱)

پس موجودہ دور کے مفتیوں کا فتویٰ دراصل مفتی کے کلام کی نقل ہے چنانچہ موصوف نے اس کی مزید

صراحت یوں کی ہے:

"پس معلوم ہوا کہ ہمارے موجودہ علماء کا فتویٰ حقیقتاً فتویٰ نہیں بلکہ مفتی کے کلام کی نقل ہے، تاکہ مستفتی اسے اختیار کر کے عمل کرے۔"(۳۲)

الغرض عصر حاضر کے علماء مجازاً مفتی کہے جاتے ہیں لیکن ان کیلئے قرآن وسنت اور فقہ میں پوری بصیرت لازمی ہے۔شرط اجتہاد سے متعلق ابن عابدین لکھتے ہیں:

''متقدمین نے مفتی کیلئے اجتہاد کی شرط بیان کی تھی جو ہمارے اس دور میں مفقود ہے، لہذا اب کم سے کم اتنی شرط تو ضرور لگائی جائیگی کہ وہ مسائل کی معرفت ان تمام قیود وشروط کے ساتھ رکھتا ہو جنہیں بسا اوقات مصنفین اس اعتماد پر چھوڑ دیتے ہیں اور صراحت نہیں کرتے، کہ فقیہ ان کو سمجھ لے گا۔''(۳۳)

حاصل کلام یہ کہ دورِ جدید میں مفتی کیلئے اس قدر کافی ہے کہ وہ قرآن وسنت کا عالم ہو اور مسائل شرعیہ میں دقیق نظر رکھتا ہو۔ چنانچہ موجودہ صدی کے عالم دین مفتی عزیز الرحمٰن نے لکھا ہے:

"مفتی کیلئے جن شرائط کا ہونا ضروری ہے، ان سارے اوصاف سے پورے طور پر متصف انسان کا ملنا آج کل مشکل ہے، لیکن موجودہ دور میں جبکہ کتب احادیث وفقہ مدون ومرتب ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔اور حافظہ کا حال بھی پہلے جیسا باقی نہیں رہا جو کبھی تھا کہ ایک عالم کو کئی کئی لاکھ حدیثیں یاد ہوا کرتی تھیں، لہذا اب دیکھا جائیگا کہ جن لوگوں کو فقہ وحدیث سے شغف ہے، کتاب وسنت میں ممارست حاصل ہے تو ان میں سے ان لوگوں کو یہ خدمت سپرد کی جائیگی اس لئے کہ اب موجودہ اصطلاح میں یہی فقیہ کہلائے جاتے ہیں۔"(۳۴)

دورِ جدید میں ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

موجودہ زمانے میں ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوگی ہے کہ محض ذاتی مطالعہ کتب کی اساس پر کار افتاء کی خدمت سرانجام دی جاسکتی ہے جبکہ یہ تصور غلط ہے۔اصول یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک منصب فتویٰ پر متمکن نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس نے علوم دینیہ معتمد علماء دین سے باضابطہ حاصل نہ کئے ہوں۔ چنانچہ اس مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ابن عابدین نے لکھا ہے:

"میں نے علامہ ابن حجرؒ کے فتاویٰ میں یہ بات دیکھی ہے کہ آپ سے ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا، جو کتب فقہ پڑھتا ہے اور خود سے مطالعہ کرتا ہے، کوئی اس کا استاد نہیں ہے اور وہ اپنے مطالعہ کتب کے اعتماد پر افتاء کا کام کرتا ہے، تو کیا یہ اس کیلئے درست ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ کسی طرح بھی اس کیلئے کارِ افتاء درست

نہیں ہے اس لئے کہ وہ درحقیقت جاہل وعامی ہے اسے خود معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے بلکہ فتویٰ دینا ان لوگوں کا کام ہے، جنہوں نے مستند علماء ومشائخ سے علم حاصل کیا ہے۔"(۳۵)

الغرض محض مطالعہ وکتب بینی فتویٰ نویسی کیلئے کافی نہیں بلکہ اس کیلئے باضابطہ تحصیل علم دین شرط ہے۔

علاوہ ازیں مفتی کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی ماہر فقیہ ومفتی کا تربیت یافتہ ہو۔ چنانچہ شرح عقود رسم المفتی میں درج ہے:

"والتخرج فی ذلک علی استاذماهر ولذاقال فی آخرمنية المفتی لو ان الرجل حفظ جميع كتب اصحابنا لابدان يتلمذللفتویٰ حتی يهتدی اليه لان كثيرامن المسائل يجاب عنه علی عادات اهل الزمان فيما لايخالف الشريعة انتهی" (۳۶)

مفتی کا محقق اور جامع ہونا:

مفتی اپنے حاصل شدہ علم پر قانع نہ رہے بلکہ اس کو تو ہمہ وقت مزید تحصیل علم کیلئے لگا رہنا چاہیے اسے چاہیے کہ گردوپیش کے حالات سے باخبر ہو اور نت نئے اُبھرنے والے مسائل پر اس کی نظر ہو چنانچہ عصر حاضر کے محقق مولانا محمد تقی عثمانیؒ اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

"مفتی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ تفقہ کے ساتھ گہری وابستگی رکھے، زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کا شوق رکھے، حاصل معلومات ہی پر اکتفاء نہ کرے بلکہ ہمیشہ نئی معلومات کے حصول کیلئے کوشش کرتا رہے۔"(۳۷)

مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں ان کے خیال میں مفتی کو مختلف علوم وفنون کا جامع ہونا چاہیے۔ بقول ان کے: "اور مفتی میں سب چیزیں ہونی چاہئیں۔ قرآن بھی، حدیث بھی، فقہ بھی، تصوف بھی۔ پھر ان شاء اللہ ایسا شخص حدود پر رہ سکتا ہے جامع نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔"(۳۸)

عوام کی چالبازیوں سے واقفیت:

عصر جدید کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضہ یہ ہے کہ مفتی مردم شناس ہو اور عوام کی چالبازیوں سے بخوبی آگاہ ہو کیونکہ آج کل لوگ اپنے ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر فتویٰ معلوم کرنے کیلئے علماء سے رجوع کرتے ہیں۔ دینی مسائل پر عمل ان کا مقصود نہیں ہوتا چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لوگوں کے عصری میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

" آج کل علماء کو اپنی جنگ کی آڑ بناتے ہیں اور خود الگ رہتے ہیں۔ میں ان کی رگوں سے خوب واقف ہوں، جوابوں میں اس کی رعایت رکھتا ہوں اس لئے یہاں کے جوابوں سے لوگ خوش نہیں ہوتے۔ ایک استفتاء آیا ہے کہ قبرستان میں لُنگی باندھ کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ نہ پوچھا کہ مسجد میں نماز کے واسطے لُنگی باندھ کر جانا جائز ہے یا نہیں۔ اس سائل نے لنگی پر پردہ کم سمجھا تو اللہ میاں کے سامنے چاہیے ننگے جائیں مگر قبرستان میں ننگے نہ جائیں۔ یہ عقیدہ کی خرابی ہے۔"(۳۹)

غرض یہ کہ مفتی کو چاہیے کہ اپنے دور کے لوگوں کی ذہنیت، ان کے خیالات اور نفسیات سے واقف ہو تا کہ وہ عوام الناس سے دھوکہ نہ کھائے۔

زمانہ کے عرف وعادت سے واقفیت:

مفتی کیلئے عرف زمانہ کی معرفت ضروری ہے جیسا کہ عقود رسم المفتی میں درج ہے:(۴۰)

مفتی کیلئے عرف زمانہ اور اپنے دور کے لوگوں کے احوال سے واقفیت اس لئے ضروری ہے تا کہ لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔ چنانچہ ابن عابدین نے لکھا ہے:

"ظهر لک ان جمود المفتی او القاضی علی ظاهر المنقول مع ترک العرف والقرائن الواضحة والجهل باحوال الناس یلزم منه تضییع حقوق کثیرة وظلم خلق کثیرین " (۴۱)

سہل پہلو اور رخصت پر فتویٰ:

اسلام دین فطرت ہے اس کے جملہ احکام میں فطرت انسانی کا خاصا لحاظ رکھا گیا ہے۔ انسان چونکہ فطرتاً خلقی ضعف اور کم ہمتی کے سبب سہولت پسند واقع ہوا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

"خُلِق الانسانُ ضَعیفاً " (۴۲) اور **"اِنَّ الاِنسَانَ خُلِق هَلُوعاً" (۴۳)** سے ثابت ہے اس لئے شریعت اسلامیہ کے جملہ احکام میں نرمی وسہولت کا عنصر غالب ہے۔ چنانچہ فقہی کلیہ ہے: **"المشقة تجلب التیسیر" (۴۴)** اس قاعدے کی اساس اس آیت کریمہ پر ہے :

" یُریدُ الله بکُمُ الیُسرَ ولایُریدُبِکُمُ العُسر"(۴۵)

نبی کریم ﷺ نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو دینی معاملات کا انتظام سپرد کر کے یمن بھیجا تو ارشاد فرمایا : **(یسرا ولا تعسرا ، وبشرا ولا تنفرو تطاوعا ولاتختلفا)**۔(۴۶)

ادیان عالم میں اسلام ہی آسان دین ہے جیسا کہ فرمان نبویؐ ہے:

''أحب الدين اِلى الله الحنيفية السمحة''(۴۷)

"اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ آسان دین حنیف محبوب ہے۔"

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ مفتی کو لوگوں کی آسانی کے پیش نظر رخصتوں پر فتویٰ دینا چاہیے۔جیسا کہ شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے:

کشف ابزدوی کے حوالہ سے عمدۃ الاحکام میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مفتی کیلئے مستحب ہے کہ عوام کی آسانی کی غرض سے رخصتوں پر فتویٰ دے جیسے حمام کے پانی سے وضو کرنا اور پاک جگہوں میں بغیر جائے نماز کے نماز پڑھنا وغیرہ۔"(۴۸)

لیکن یہ رخصت عوام الناس کیلئے ہے خواص کیلئے نہیں ہے موصوف نے آگے اس کی وضاحت کر دی ہے : "یہ رخصت گوشہ نشینوں کیلئے مناسب نہیں ہے، بلکہ ان کیلئے بہتر یہ ہے کہ یہ احتیاط کو اختیار کریں اور عزیمت پر عمل کریں۔"(۴۹)

مصلحت کو ترجیح:

اسلامی قانون کی مقصدیت "مصلحت" پر استوار ہے۔کوئی بھی حکم مقاصد اور مصالح کے دائرہ سے خارج نہیں ہے جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے:

"ان الشريعة مبناها و اساسها على الحكم و مصالح العبادفى المعاش و المعاد"(۵۰)

پوری شریعت اسلامیہ حصول نفع اور دفع ضرر سے عبارت ہے۔بقول عزالدین ابن عبدالسلام:

"ان الشريعة كلها مصالح ، امادر مفاسد اوجلب منافع" (۵۱)

اس سے واضح ہے کہ اسلام کے تشریعی فکر میں مصلحت کا خاصا لحاظ رکھا گیا ہے۔یہی سبب ہے کہ فتویٰ دیتے وقت مفتی بھی مصلحت کی رعایت کا پابند ہے اگر کسی مسئلہ میں دو صحیح اقوال ہوں تو اسے اختیار ہے کہ ان دو میں سے جسے مصلحت کے مطابق پائے اس پر فتویٰ دے جیسا کہ **الاشباہ والنظائر** میں درج ہے:

"المفتى انمايفتى بما يقع عنده من المصلحة كما فى مهر البزازية"(۵۲)

جائز اور ناجائز حیلے:

مفتی کے لئے ناجائز اور مکروہ حیلے اختیار کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی اس کیلئے رخصتوں کی جستجو میں پڑنا جائز ہے۔ چنانچہ اس مسئلے کی وضاحت ابن قیم نے یوں کی ہے:

"حرام اور ناجائز حیلوں کی تلاش و جستجو مفتی کیلئے درست نہیں، اسی طرح ایسے فرد کیلئے رخصتوں کی جستجو میں پڑنا بھی جائز نہیں ہے۔ جو ناجائز حصول نفع کا ارادہ رکھتا ہو، کیونکہ یہ فسق ہے اور اس طرح کا استفتاء حرام ہے۔"(۵۳)

غرض یہ کہ فتویٰ میں تساہل اور ایسے حیلوں کو اختیار کرنا جو اغراض فاسدہ کے پیش نظر ہوں، ناجائز ہے۔ البتہ وہ حیلے جو شریعت کی رو سے جائز ہیں اور ان میں کوئی شرعی مفسدہ نہیں ہے۔ ان کے ساتھ فتویٰ دینا درست ہے۔ چنانچہ بقول ابن قیم:

"اگر کوئی جائز حیلہ اچھے ارادہ سے اختیار کرے، جس میں نہ کوئی شبہ ہو، نہ مفسدہ بلکہ منشاء مستفتی کو تنگی سے نکالنا ہو تو یہ جائز ہے بلکہ مستحب، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت ایوبؑ کو حنث سے بچاؤ کیلئے رہنمائی فرمائی تھی اور بتایا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا لے لیں اور اس سے اپنی اہلیہ کو ایک مرتبہ ماریں۔"(۵۴)

اوصاف مفتی:

کچھ خصوصیات ایسی ہیں جن سے مفتی کا متصف ہونا ضروری ہے کیونکہ فتویٰ کی خدمات سرانجام دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مفتی کیلئے اگر ایک طرف فقہی بصیرت ضروری ہے تو دوسری طرف اس کیلئے طہارت نفس بھی امر ناگزیر ہے تاکہ وہ محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کارِ افتاء کو سرانجام دے اور نفسانی خواہشات کا شکار نہ ہو۔

نیک نیتی اور رضائے الٰہی:

نیت صالحہ اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی وہ دو بنیادی اوصاف ہیں۔ جن کا مفتی کی ذات میں پایا جانا لازمی ہے چنانچہ محمد سلیمان الأشقر اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مفتی کو چاہیے کہ وہ اپنے باطن کی بھی اصلاح کرے اور نیت کو نیک رکھے کہ وہ دین کے احکام بتلانے میں رسول اللہ ﷺ کا نائب بھی ہے اور اس طرح وہ اس عہد کو بھی پورا کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے علماء سے لے رکھا

ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حق کو بیان کریں۔۔۔مفتی کو چاہیے کہ ہر چیز میں اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہو اور ان کا مقصود لوگوں کی تعریف اور شہرت وریا کاری وغیرہ نہ ہو۔"(۵۵)

الغرض لوگوں کے حقوق کے تحفظ اور سلامتی دین کیلئے مفتی کا خدا پرست ہونا ناگزیر ہے۔

شگفتہ مزاجی:

مفتی کیلئے ضروری ہے کہ وہ نہایت بردبار اور خوش طبع ہو، وہ کینہ پور اور درشت خو نہ ہو چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں لکھا ہے:

"مفتی کو متواضع اور نرم خو ہونا چاہیے سخت کینہ پرور اور درشت خو اور سخت دل نہیں ہونا چاہیے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے اوصاف میں نرم خوئی کا تذکرہ کیا ہے اور اسے سراہا ہے۔"(۵۶)

امام احمد بن حنبلؒ نے مفتی کیلئے پانچ اوصاف کو ضروری قرار دیا ہے ان میں سے ایک وصف علم و وقار بھی ہے۔چنانچہ مولانا ظفیر الدین نے لکھا ہے:

"امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جب تک کسی میں پانچ چیزیں نہ ہوں، مسند افتاء کو زینت بخشنے کی جرأت نہ کرے : (۱) نیت صالحہ (۲) حلم و وقار (۳) مسائل میں بصیرت اور ان پر ثابت قدمی کے نشان (۴) بقدر ضرورت ذرائع معاش (۵) لوگوں کے احوال کی معرفت"(۵۷)

امام نوویؒ نے مفتی کیلئے جن اوصاف کو لازمی قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:

"مفتی کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ مکلّف، مسلم، ثقہ، امین، اسباب فسق اور بے مروتی کے کاموں سے مجتنب، فقیہ النفس، سلیم الذھن، صحیح الفکر، تصرف واستنباط کے اعتبار سے بھی صحیح اور بیدار مغز ہو۔"(۵۸)

حاصل کلام یہ کہ مفتی کو علم وعمل دونوں کا جامع ہونا چاہیے۔

(ج) اصول وآداب برائے مستفتی

مفتی کے ساتھ ادب سے پیش آنا:

مستفتی جب فتویٰ پوچھے تو اسے چاہیے کہ مفتی کا آدب کرے۔اور کسی قسم کی گستاخی کا مرتکب نہ ہو چنانچہ ابن صلاح نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

"مستفتی کو چاہیے کہ وہ مفتی کے آدب کو بھی ملحوظ رکھے، اسے مخاطب کرتے وقت اور اسے سوال کرتے

وقت ادب واحترام کا مظاہرہ کرے، اس کے سامنے ہاتھ سے اشارہ نہ کرے، اور نہ یہ کہے کہ اس مسئلہ کی بابت تجھے کیا کچھ یاد ہے؟ فلاں فلاں مسئلہ میں تیرے اِمام (مثلاً امام شافعیؒ) کا کیا مذہب ہے؟ اور جب مفتی جواب دے دے تو یہ بھی نہ کہے کہ میں بھی یہ کہتا ہوں، میرا بھی یہ خیال ہے اور نہ یہ کہے کہ مجھے فلاں نے فتویٰ دیا ہے اور نہ یہ کہے کہ آپ کے علاوہ دیگر مفتیوں نے یہ فتویٰ دیا ہے۔"(۵۹)

الغرض سائل کو چاہیے کہ وہ مفتی کا ہر طرح ادب کرے۔ مستفتی کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ مفتی سے یہ مطالبہ کرے کہ جواب اگر اس کی منشاء کے مطابق ہو تو اسے تحریر کرے ورنہ نہ لکھے بتصریح امام نوویؒ :

"ولا یقل ان کان جوابک موافقالمن کتب فاکتب والافلا تکتب" (۶۰)

مستفتی کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ مفتی سے اس وقت مسئلہ دریافت کرے جب وہ حالت اعتدال میں ہو جیسا کہ ابن صلاح نے لکھا ہے:

"ولایسـاله وهو قائم ، اومستوفزا ، اوعلی حالة ضجر ، اوهم، اوغیرذلک ممایشغل القلب"(۶۱)

"اور وہ مفتی سے اس وقت فتویٰ نہ پوچھے جب وہ کھڑا ہو یا گھبراہٹ کے عالم میں ہو یا کسی تنگی یا غم وغیرہ کی ایسی حالت میں ہو جو دل کو مشغول کر دیتی ہے۔"

لائق مفتی کا انتخاب:

فتویٰ نویسی کے باب میں نہ صرف مفتی بلکہ مستفتی کو بھی حد درجہ محتاط رہنا چاہیے۔ وہ ہر حافظ و مولوی سے مسئلہ معلوم نہ کرے بلکہ اس کیلئے کسی اہل ترین مفتی کو تلاش کرے بتصریح مفتی عزیز الرحمٰن :

"مفتی و مستفتی دونوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس باب میں احتیاط سے کام لیں، مستفتی کو چاہیے وہ دیکھ لے کہ جس سے مسئلہ دریافت کر رہا ہے، وہ اس منصب کے لائق بھی ہے یا نہیں۔"(۶۲)

اس صدی کے مفکر مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے:

"لوگ کیف ما اتفق کسی سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی نہیں تحقیق کرتے کہ واقعی یہ شخص عالم بھی ہے یا نہیں کسی کا نام مولوی سُن لیا اور اس سے دین کی باتیں پوچھنے لگے اور بعض اوقات عالم معلوم ہوتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس مشرب کا ہے کس عقیدہ کا ہے؟ ایسے شخص کے جواب میں بعض اوقات تو عقیدہ یا عمل میں خرابی

ہوجاتی ہےاوربعض اوقات تردد وشبہ میں پڑ کر پریشان ہوتا ہے یا پریشان کرتا ہے۔"(۶۳)

یہی سبب ہے کہ فقہاء نے نااہل مفتی کی تعزیر کو لازمی قرار دیا ہے چنانچہ ابن عابدینؒ کا بیان ہے:

"جو افتاء کے لائق نہ ہو اور اس منصب عظیم پر آدھمکے اس کی تعزیر شدت کے ساتھ لازم ہے اور ایسی سختی ایسے لوگوں کے ساتھ ہونی چاہیے کہ پھر وہ اس طرح کی جرأت نہ کرسکیں، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو انتہا مفاسد کے دروازے کھل جائیں گے۔"(۶۴)

ابن خلدون کے خیال میں خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ فتویٰ نویسی کیلئے علماء و مدرسین میں سے کسی قابل عالم کو منتخب کرے اور فتوے اس سے لکھوائے جو فتوے لکھنے کا اہل ہو۔(۶۵)

مذکورہ مسئلہ عصر جدید کے علماء کے پیش نظر بھی رہا ہے۔اسلامی نظریاتی کونسل نے مفتیوں کے تقرر کے سلسلے میں حسب ذیل سفارشات پیش کی ہیں:

"بہ سہولت انصاف رسانی کے سلسلے میں محکمہ افتاء کا قیام ازبس ضروری ہے۔لہذا کونسل تجویز کرتی ہے کہ ہر عدالت میں کم ازکم ایک ایسے عالم کا تقرر کیا جائے جو عدالت اور عوام کو بلااجرت قانونی مشورہ دیا کرے۔تقرر ایسے عالم کا کیا جانا چاہیے جو فقہ اور قانون موجودہ دونوں کا علم رکھتا ہو۔یہ ضروری ہے کہ ایسے عالم کا معاوضہ خدمت وغیرہ عدالت متعلقہ کے اعلیٰ حاکم کے مساوی ہو۔"(۶۶)

حاصل کلام یہ کہ کار افتاء کے سلسلے میں نہ صرف مفتی اور مستفتی کا محتاط رہنا ضروری ہے بلکہ حکومت وقت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس منصب کے لئے لائق ترین مفتیوں کا انتخاب کرے۔

ایک ہی مسئلہ کو کئی جگہ دریافت کرنا:

مستفتی کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی مسئلہ کو کئی جگہ نہ پوچھے کیونکہ اس طرح سائل کو تسلی وتشفی نہیں ہوتی۔چنانچہ گزشتہ صدی کے مفکر مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک ایسا کرنا سائل کیلئے نقصان دہ ہے اس کی علت آپ نے یوں بیان کی ہے:

"فرمایا کہ دو جگہ مسئلہ نہ دریافت کیا کرو اس طرح تسلی وتشفی نہیں ہوتی بلکہ تشویش بڑھ جاتی ہے۔جن سے عقیدت ہو اس سے دریافت کرو۔اور اگر چند جگہ دریافت کرو تو فیصلہ خود کیا کرو۔ایک کا جواب دوسری جگہ دوسرے کے سامنے نقل کرنا بالکل نامناسب ہے،اور کوئی عالم کسی کا مقلد نہیں ہوسکتا۔"(۶۷)

ایک ہی مفتی کا انتخاب کرنا:

حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مستفتی بیک وقت مختلف مفتیوں سے مسائل دریافت نہ کرے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا کرنے سے نفس کی پیروی ہوتی ہے جو کہ حرام ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کی تصریح یوں کی ہے:

"اسی طرح مذہب کے علماء اخیار میں سے ایک ہی کو متعین کر لینے میں یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے لوگوں پر غرض پرستی غالب ہے اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے۔ پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائیگا تو اس میں خدشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائیں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا۔"(۶۸)

مسائل کے دلائل وعلل نہ پوچھنا:

اس سلسلے میں علماء کے درمیان قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک عام آدمی مفتی سے دلیل نہیں پوچھ سکتا لیکن کچھ علماء کے خیال میں ایسا کرنا درست ہے چنانچہ امام نوویؒ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"عامی مفتی سے نہ تو دلیل کا مطالبہ کر سکتا ہے اور نہ ہی یہ انداز اختیار کر سکتا ہے کہ آپ نے یہ بات کیوں کہی ہے، اگر وہ دلیل سن کر اپنے دل کو تسکین دینا چاہیے تو وہ مفتی سے کسی اور مجلس میں دلیل پوچھ لے، فتویٰ قبول کرنے کے بعد اسی مجلس میں بھی دلیل پوچھ سکتا ہے۔ سمعانیؒ فرماتے ہیں کہ دلیل پوچھنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، مفتی کیلئے لازم ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی امر مانع نہیں ہے، مفتی کیلئے لازم ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی قطعی دلیل ہو تو اسے بیان کر دے اور اگر قطعی نہ ہو تو نہ بیان کرے کیونکہ اسے سمجھنے کیلئے اجتہاد کی ضرورت ہوگی اور عام آدمی اس سے قاصر ہوتا ہے لیکن درست پہلی بات ہے۔"(۶۹)

مستفتی کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ غیر ضروری اور فضول سوالات پوچھنے سے اجتناب کریں۔(۷۰)

نتائج:

۱۔ یہ محض اسلامی قانون ہی کی انفرادی خصوصیت ہے کہ اس میں ادارۂ افتاء جیسا عظیم ور منفرد ادارہ موجود ہے حالانکہ دنیا کے دیگر قوانین اس سے بالکل نا آشنا ہیں۔

۲۔ اسلامی نظام عدل میں افتاء، مفتی اور مستفتی کیلئے باقاعدہ آداب مقرر ہیں جنہیں ملحوظ خاطر رکھنا دونوں پر

لازم ہے۔

۳۔ کتب فقہ میں آداب افتاء کی تین طرح درجہ بندی کی گئی ہے:

i۔ آداب برائے فتویٰ

ii۔ آداب برائے مفتی

iii۔ آداب برائے مستفتی

۴۔ ایک اسلامی ریاست میں حکومت وقت پر لازم ہے کہ وہ ہر جگہ اہل ترین اور لائق مفتیوں کو تعینات کرے تا کہ لوگ مختلف قانونی پیچیدہ گیوں سے بچ سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالقاسم الحسین بن محمد، راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۰ھ، ص ۳۷۹

۲۔ ابوالفضل محمد، ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، ج ۱۵، ص ۱۴۸

۳۔ محمد بن یعقوب فیروز آبادی، القاموس المحیط، مطبع مصطفیٰ محمد، ۱۹۱۳ء، ج ۴، ص ۳۷۳

۴۔ عثمان بن عبدالرحمٰن ابن صلاح، ادب المفتی والمستفتی، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۰۶ھ، ج ۱، ص ۸۱

۵۔ اشرف علی تھانویؒ، مولانا، تحفۃ العلماء، محمد زید (مرتب) ادارہ تالیفات اشرفیہ، بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان، ۱۴۱۵ھ ج ۲، ص ۲۶۶ ۔ ۲۶۷

۶۔ ابوزکریا، یحیٰی بن شرف النووی، المجموع، شرح المھذب، المکتبہ السلفیۃ، المدینۃ المنورۃ، ۱۳۴۴ھ، ج ۱، ص ۵۰

۷۔ اشرف علی تھانویؒ، مولانا، تحفۃ العلماء، محمد زید، ج ۲، ص ۲۸۳

۸۔ ایضاً، ص ۲۸۵

۹۔ محمد بن ابی بکر ابن قیم، اعلام الموقعین، دار الجیل، بیروت، لبنان، ج ۴، ص ۱۸۷

۱۰۔ ابن صلاح، ادب المفتی والمستفتی، ج ۱، ص ۷۶۔۷۷

۱۱۔ احمد بن محمد بن اسماعیل طحطاوی، حاشیۃ علی درمختار، بولاق، مصر، ت ن، ج ۱، ص ۴۹

۱۲۔ اشرف علی تھانویؒ، مولانا، تحفۃ العلماء، محمد زید، ج ۲، ص ۲۷۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔۲۷۲

۱۴۔ عزیز الرحمٰن، مفتی، فتاویٰ دار العلوم دیوبند، محمد ظفیر الدین، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ت ن، ج ۱، ص ۱۰۱

۱۵۔ طحطاوی، حاشیۃ علی درالمختار، ج ۱، ص ۴۹

۱۶۔ المرجع السابق، ص ۱۰۲

۱۷۔ ابوالحسن علی بن خلیل طرابلسی، معین الحکام، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ت ن، ص ۳۲

۱۸۔ ابن صلاح، ادب المفتی والمستفتی، ج ۱، ص ۸۳

۱۹۔ ایضاً، ج ۱، ص ۷۶

۲۰۔ امام نوویؒ، شرح المہذب، ج ۱، ص ۴۹

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ فتاویٰ ھندیہ، بولاق، ۱۳۱۰ھ، ج ۳، ص ۳۰۹

۲۳۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر، ردالمختار، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ج ۴، ص ۴۱۸

۲۴۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراھیم، البحر الرائق، قاری محمد اسماعیل، من المکتبۃ الماجدیۃ، کوئٹہ، ج ۶، ص ۲۶۶

۲۵۔ فتاویٰ ھندیہ، ج ۳، ص ۳۰۹

۲۶۔ ابن صلاح، ادب المفتی والمستفتی، ج ۱، ص ۴۴

۲۷۔ المرجع السابق

۲۸۔ ابن قیم، اعلام الموقعین، ج ۲، ص ۲۵۶

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً، ج ۱، ص ۱۲

۳۱۔ ابن عابدینؒ، ردالمختار، ج ۶، ص ۲۵۶

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ ابن عابدینؒ، عقود رسمی المفتی، قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ، کراچی، ت ن، ص ۳۸۔۳۹

۳۴۔ عزیز الرحمٰن، مفتی، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، محمد ظفیر الدین، ج ۱، ص ۸۲

۳۵۔ المرجع السابق، ص ۸

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۹

۳۷۔ محمد تقی عثمانیؒ، مفتی، اصول الافتاء، عبداللہ شوکت، ت ن، ص ۷۰

۳۸۔ اشرف علی تھانویؒ، مولانا، تحفۃ العلماء، محمد زید، ج ۲، ص ۲۴۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۵۸۔۲۵۹

۴۰۔ ابن عابدینؒ، شرح عقود رسم المفتی، ص ۴۰

۴۱۔ ایضاً،ص۴۱

۴۲۔ النسآء،۴:۲۸

۴۳۔ المعارج،: ۱۹

۴۴۔ مجلۃ الاحکام العدلیۃ، بیروت،المطبعۃ الادبیۃ،۱۹۲۳ء،ص ۱۸

۴۵۔ البقرۃ،۲:۱۸۵

۴۶۔ خطیب تبریزی،مشکوٰۃ،کتاب امارۃ،باب ماعلی الولاۃ من التیسیر ،ج۲،ص۱۰۹۹

۴۷۔ بخاری،محمد بن اسماعیل،الصحیح،کتاب الایمان،باب الدین یُسر،ج۱،ص۱۶

۴۸۔ شاہ ولی اللہؒ،عقدالجید،م ن،ت ن،ص۷۳

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ ابن قیم،اعلام الموقعین،ج۳،ص۳

۵۱۔ عزالدین بن عبدالسلام،قواعدالاحکام فی مصالح الانام،دارالجیل،۱۴۰۰ھ،ج۱،ص۹

۵۲۔ ابن نجیمؒ،الاشباہ والنظائر،دارالفکر،دمشق،۱۹۸۳ء،ص۳۱۸

۵۳۔ ابن قیمؒ،اعلام الموقعین،ج۲،ص ۲۵۸

۵۴۔ ایضاً

۵۵۔ محمد سلیمان الاشقر،الفتیا ومناھج الافتاء،م ن،ت ن،ص۶۲

۵۶۔ عزیزالرحمٰنؒ،مفتی،فتاویٰ دارالعلوم دیوبند،محمد ظفیر الدین،ج۱،ص ۹۵

۵۷۔ ایضاً،ص۹۰

۵۸۔ امام نوویؒ،شرح المھذب،ج۱،ص ۴۱

۵۹۔ ابن صلاحؒ،ادب المفتی والمستفتی،ج۱،ص ۹۱

۶۰۔ المرجع السابق،ص۵۷

۶۱۔ ابن صلاحؒ،ادب المفتی والمستفتی،ج۱،ص ۹۱

۶۲۔ عزیزالرحمٰن،مفتی،فتاویٰ دارالعلوم دیوبند،محمد ظفیر الدین،ج۱،ص۷۹

۶۳۔ اشرف علی تھانویؒ،مولانا،تحفۃ العلماء،محمد زید،ج۲،ص۳۶۶

۶۴۔ ابن عابدین،شرح عقود رسم المفتی،ص۸

۶۵۔ ابن خلدونؒ،عبدالرحمٰن بن محمد،المقدمۃ،دارالفکر،بیروت،لبنان،۱۴۰۸ھ،ص۱۶۵

۶۶۔ رپورٹ اسلامی نظام عدل، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، ۲۳/ جمادی الاولیٰ، ۱۴۰۴ھ، ص ۱۰۵

۶۷۔ اشرف علی تھانویؒ، مولانا، تحفۃ العلماء، محمد زید، ج ۲، ص ۳۷۰

۶۸۔ ایضاً

۶۹۔ امام نوویؒ، شرح المھذب، ج ۱، ص ۵۷۔۵۸

۷۰۔ المرجع السابق، ص ۳۶۷